ڈاکٹر احسان الٰہی رانا

مجددِ الفِ ثانیؒ کا عظیم کارنامہ*

معروف ہے کہ ایک بار ہلاکو خان (۶۱۴ - ۶۶۳ھ) نے اپنے چند ساتھیوں کو مال و زر کے ساتھ بغداد بھیجا کہ پارچہ جاتِ فاخرہ خرید کر لائیں۔ جب وہ سوق شارجہ میں داخل ہوئے تو پہلے سب سے بڑے تاجر کے پاس گئے۔ بیس ہزار کا مال خریدا۔ ابھی کچھ اور خریدنا چاہتے تھے۔ مال موجود تھا۔ دکان بھری ہوئی تھی۔ مگر تاجر نے کہا: اب آپ میرے کسی اور بھائی سے بھی مال خرید لیجیے۔ وہ اٹھے اور دوسرے سوداگر کے پاس پہنچے۔ وہاں سے بھی جب پندرہ بیس ہزار کا مال اٹھا چکے تو سوداگر نے درخواست کی: اگر آپ کو ابھی کچھ اور خریدنا ہے تو ساتھ والی کسی دکان سے بھی خرید لیجیے۔ اس طرح وہ پانچ چھ دکانوں سے مال لے کر واپس چلے گئے۔

ہلاکو خان نے آٹھ دس سال کے بعد انہی دوستوں کو پھر خرید و فروخت کے لیے بغداد بھیجا۔ وہ اسی شوق سے شارجہ میں پہنچے اور سب سے بڑے تاجر کے ہاں اترے اور مال خریدتے گئے۔ بیس تیس، چالیس ہزار کا مال خرید چکے تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ اب ساتھ والی دکان سے بھی کچھ مال لے لیا جائے تو سوداگر نے روک لیا اور کہا: وہاں مال گھٹیا ہے اور دام اونچے ہیں، آپ حکم کیجیے سب کچھ یہیں حاضر پائیں گے۔ پچاس ساٹھ ہزار کا مال لے کر وہ پھر اُٹھنے لگے تو سوداگر نے کہا: آپ ادھر ادھر گھومنے کی زحمت نہ فرمائیے، یہاں سے سستا مال کہیں دستیاب نہ ہو گا۔ بہرحال وہ اٹھ کر ایک اور دکان پر چلے گئے۔ وہاں سے پندرہ بیس ہزار کا مال لیا اور اگلی دکان کا ارادہ کر رہے تھے تو اس دکان دار نے بھی روکا اور بڑی رازداری سے کہا: سوائے اس خادم کے بازار میں سب چور اُچکے بیٹھے ہیں۔ اطمینان سے تشریف رکھیے اور یہیں آپ کی ہر فرمائش پوری ہو جائے گی۔ سوئی سے لے کر ہاتھی تک

---

* یہ مضمون ایک طویل مقالہ سے ماخوذ ہے جو شامِ ہمدرد، لاہور میں پڑھا گیا تھا۔

ہر مال موجود ہے۔

یہ سرگزشت جب ہلاکو خان نے سنی تو خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے کہا: قصہ تمام شد۔ اسلام بغداد سے رخصت ہو چکا۔ سمجھو ہم بغداد میں داخل ہو گئے ..... خانۂ خالی را دیوان مے گیرند..... اور یہی ہوا۔ ادبار کا ریلا آیا، سب کچھ بہا کر لے گیا۔[1]

یہ روایت اپنی جگہ پر ہے۔ مورخوں کی نیرنگیٔ فکر نے سقوطِ بغداد کے کیا کیا عوامل پیش کیے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنوں نے غداری کی۔ دشمن کو خود اپنے ہی گھر پر حملہ کرنے کی دعوت دی، اور ایسا ہی ایک اور ناٹک اسپین میں بھی کھیلا گیا۔ پھر سلطان المجاہدین سلطان ٹیپو کے خلاف بھی یہی حربہ استعمال ہوا۔

یہ کیوں ہوا اور ایسے کیوں ہوا کرتا ہے؟ اس لیے کہ پوری کائنات میں "تنازع للبقاء" کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ حق و باطل، خیر و شر، نور و ظلمت ازل سے باہم دگر متصادم رہے ہیں۔ کاروبارِ عالم کی بوالعجبی ہے کہ مکان و زمان کے اعتبار سے حق و باطل کے محاربے رنگا رنگ کے منظر پیش کرتے ہیں۔ کبھی ایک کی پیش قدمی، کبھی دوسرے کی یورش! کبھی ایک اپنا پھریرا لپیٹ کر اس میدان سے بھاگا تو دوسرے میدان سے اکلیلِ غار پہن کر جم گیا اور پینترے بدل بدل کر وار کرنے لگا۔ اس آویزش کا ایک حصہ سرزمینِ ہند میں بھی منصۂ شہود پر آیا۔

یہ زمانہ ساتویں صدی ہجری کے اواخر کا ہے جب خلافتِ عربی کے نوحے پڑھے جا چکے تھے۔ تاتاریوں نے ایک ایک کر کے بلادِ اسلامیہ کے مرکزوں کو تاخت و تاراج کر دیا۔ مسجدیں سنسان، مدرسے ویران، ٹمٹماتے ہوئے چراغ بھی بجھ گئے۔ نہ مرکز رہا، نہ شریعت کا محافظ، نہ امت کا رہبر۔ اہلِ اسلام تھے کہ ایک ابنوہِ آدم لرزاں و ترساں۔ جو زندہ تھے سوزندہ درگور۔ یا بھٹکا ہوا کارواں تھا، یا مالا کے بکھرے ہوئے موتی، یا خوف زدہ منتشر بھیڑیں۔ یہ حال تھا بقولِ غالب:

ہوا مخالف و شب تار و ناخدا خفت است

---

[1] ابن الطقطقی: الفخری ۴۱۷۔

کچھ ایسے بھی تھے جنھیں تصوف کی میٹھی لوریوں نے سُلا دیا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو خرد کی گتھیاں سلجھاتے رہ گئے اور اکثر وہ تھے جنھوں نے "عمل" کو نسیان و بیگانگی کا ہدف بنالیا؛ اس عمل کو جس سے بقول علامہ اقبال:

"زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"

مولانا ابوالکلام آزاد نے قصرِ تاریخ کے جھروکوں میں جھانکا تو انھیں نظر آیا کہ جملہ مفاسد — فکری، نظری یا عملی — جن سے ہم آج کل دوچار ہیں، دراصل اسی دورِ پُرآشوب میں پیدا ہوئے یا پیدا ہو چکے تھے اور اسی عالم آشوبی میں کمال و بلوغ کو پہنچے اور لوگوں کی توجہ علومِ اصلیہ یعنی قرآن و سنت سے دُور ہوتی چلی گئی۔[۲]

اس ضمن میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے ایک حکمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اپنے ایک مکتوب بنام میر نعمان میں لکھا: شریعت کی ترقی اور عزت و نصرت فقط شاہان بزرگ کے حسنِ انتظام پر موقوف ہے۔ جب سے یہ ضعیف ہوا اسلام بھی ناچار ضعیف ہوا۔[۳] تاریخِ ہند سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ سلطان علاء الدین خلجی (متوفی شوال ۱۵/۷ جنوری ۱۳۱۶) کو فنِ تعمیر سے ازلی مناسبت تھی۔ اس نے کیا کیا کام کیے؟ بس اس کا ایک دروازہ دہلی کا ہی دیکھ لیجیے..... مگر وہ دروازہ جو اس نے کھول دیا دین کو مقہور و مغلوب رکھنے کا وہ بند نہ ہوا[۴] اس نے پہلی ہی اینٹ ٹیڑھی رکھی اور:

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج — تا ثریا می رود دیوار کج

نام تو علاء الدین تھا مگر کام "علاء الدولہ" کا۔ محمد تغلق بھی اسی ڈگر پر چلا۔ اس نے بھی ہوسِ اقتدار و ریاست پر اپنے فریضۂ دین پروری کو قربان کر دیا[۵]..... بس کیا تھا گاڑی چل

---

[۲] مقالات، ۲: ۳۱۵

[۳] مکتوبات امام ربانی ۲: ۶۲ (مکتوب ۹۲)

[۴] ا.ب. پانڈے: رسالہ انڈین ہسٹاریکل کانگرس ۱۹۴۷، مقالہ ص ۳۱۰-۳۱۴۔

[۵] محمد تغلق کے ایک سکے پر یہ عبارت کندہ ہے: من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمان۔

پڑی .... شہنشاہ اکبر کا دَور آیا ..... اس دَور میں جبر و استبداد کا دَور دورہ تھا۔ شریعت معطل ہو کر رہ گئی۔ علما اپنی جگہ مغلوب و مقہور، اہلِ اسلام الگ مجبور۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ خود بیان فرماتے ہیں: گزشتہ زمانے میں کافر غالب ہو کر دار السلام میں کفر کے احکام جاری کرتے تھے اور اہلِ اسلام، اسلام کے احکام جاری کرنے سے عاجز و مجبور تھے اور اگر کرتے تو قتل کر دیے جاتے تھے[۵۶] اسی طرح میر محمد نعمان کو تحریر کرتے ہیں: کفار ہند بے تحاشا مسجدوں کو منہدم کر کے ان کی جگہ اپنے مندر تعمیر کر رہے ہیں۔ چنانچہ تھانیسر میں حوض کر کھیت کے کنارے ایک مسجد تھی اور ایک بزرگ کا مقبرہ بھی تھا۔ اسے گرا کر اس کی جگہ بڑا بھاری مندر بنایا گیا ہے۔ کفار اپنی رسوم کو علانیہ بجا لاتے ہیں اور اہلِ اسلام اکثر اسلامی احکام جاری کرنے میں عاجز ہیں۔ ایکادشی (گیارھویں) کے دن ہندو کھانا پینا ترک کر دیتے ہیں اور اس بات کا بڑا اہتمام کرتے ہیں کہ اسلامی شہروں میں بھی اس دن کوئی مسلمان روٹی نہ پکائے، نہ بیچے۔ لیکن وہ خود رمضان المبارک میں علانیہ نان و طعام پکاتے ہیں اور بیچتے ہیں۔ مگر اسلام کی زبونی اور مغلوبیت کے باعث انھیں کوئی روک نہیں سکتا۔ افسوس! بادشاہِ وقت ہم میں سے ہو اور ہم فقیروں کا حال ایسا خستہ و خراب ہو[۵۷]

ایک اور مکتوب میں (بنام لالہ بیگ) بیان فرماتے ہیں: تقریباً ایک سو سال سے اسلام پر اس قسم کی غربت چھا رہی ہے کہ کافر اہلِ اسلام کے شہروں میں صرف کفر کے احکام جاری کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کی تمنا ہے کہ اسلامی احکام بالکل دُور ہو جائیں، اور اسلام اور اہلِ اسلام کا کچھ اثر نہ رہے۔ نوبت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی مسلم اسلامی شعار کو ظاہر کرتا ہے تو قتل کر دیا جاتا ہے۔ گائے کا ذبح کرنا دیارِ ہند میں اسلام کا ایک ممتاز ترین شعار ہے۔ کفار شاید جزیہ دینے پر رضامند ہو جائیں گے مگر ذبیحہ بقر پر ہرگز راضی نہ ہوں گے۔ اس سلطنت کی ابتدا ہی میں اگر مسلمانی نے رواج پا لیا تو بہتر، ورنہ نعوذ باللہ توقف اور دیر ہو گئی تو

---

[۵۶] مکتوبات امام ربانی، ۱: ۶۵ (مکتوب ۴۷)

[۵۷] م، س - ۲: ۱۶۲ (مکتوب ۹۲)

کام بہت دشوار ہو جائے گا۔ الغیاث۔ الغیاث۔ ثم الغیاث۔ دیکھیے کون صاحبِ دولت اس سعادت کا حق دار بنتا ہے[۵۸]؟

ہند میں حالات کچھ اس طرح تھے کہ ایک طرف تو کفار علی الاعلان اسلام اور شعائرِ اسلام کی تحقیر و تذلیل کا سامان کرتے تھے، ادھر شہنشاہ اکبر رموز و مصالح سلطنت سے مجبور ہو کر کفر و الحاد کی پشت پناہی کرنے لگا۔ چنانچہ اس نے حفاظتِ دین کا فرض ساقط کر دیا۔ خود اہلِ اسلام بھی احکامِ شریعت سے اس قدر غافل ہو گئے تھے اور رسومِ اسلامیہ سے اس قدر ناآشنا تھے کہ اسلامی اور غیر اسلامی رسوم میں امتیاز نہ کر سکتے تھے۔ ملک کے اندر بے دینی اور بدعت کی ایسی ہوا چلی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آندھی کی شکل اختیار کر لی، پھر آندھی سے طوفان اور طوفان سے سیلِ بے ہنگام بن گئی۔ اس کی تندی اکبر کی موت کے بعد بھی قائم رہی[۵۹]

بظاہر جہانگیر نے احکامِ شریعت کے موافق انصاف و انتظام کی کوشش کی، مگر حق تو یہ ہے کہ اس سے اس عہد کا حق ادا نہ ہو سکا۔ اور یہ کیسے ممکن ہوتا جب کہ وہ خود اپنے آپ کو ام الخبائث کی گرفت سے آزاد نہ کر سکا۔ وہ بھی "ظل اللہ" کے نام سے خدائی کرتا تھا۔ اس کے سینے میں بھی فرعونیت کا سمندر کھولتا تھا اور وہ بھی اپنے لیے "سجدہ" کو روزمرہ کے آداب میں شمار کرتا تھا۔ ایسے شخص سے اصلاح کی کچھ زیادہ توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

کیا اس دور میں ہندوستان علما اور مشائخِ حق سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ نہیں۔ اس دقیق کی امتِ اسلامیہ ہند کو جو ایک ننھی سی اقلیت تھی، اللہ تعالیٰ نے کیسے کیسے کبار العلما عظام الفضلا فراہم کیے تھے۔ ان میں اچھے لوگ بھی تھے مگر ان کی پیش نہ جاتی تھی۔ ملا محمد یزدیؒ اور معز الملکؒ نے جب بادشاہ کی بے دینی پر اس کے خلاف جہاد کے جائز کا فتویٰ دیا تو انھیں جامِ شہادت پلا دیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ط

لیکن عام علما اور مشائخ دامن لپیٹ کر اور "ہمیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را" کہہ کر

---

۵۸ م س، ۱: ۱۰۶ (مکتوب ۸۱)

۵۹ محمد فرمان: حیاتِ مجدد، لاہور ۱۹۵۸، ۶۰-۶۱

ہو گئے تھے۔ اور کبھی کہتے تھے: عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ اور لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ[۱۰] یعنی خوفِ جان ہے، جان بچانا فرض ہے۔

کچھ علما لطائف الحیل کے قائل تھے۔ حیلے تراشتے اور تاویلیں گھڑ لیتے تھے۔ کبھی کہتے تھے: زبان کھولنے میں فتنہ ہے اور سکوت میں امن و آشتی۔ اور لوگوں کو تلقین کرتے تھے: چشم بند و لب ببند و گوش بند۔

کچھ یہ کہتے تھے کہ ہمیں صداقتِ موسوی سے انکار نہیں لیکن ہیبت و سطوتِ فرعونی کے مقابلے کی تاب کہاں سے لائیں: عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهِمْ اَنْ یَّفْتِنَهُمْ[۱۱]۔ اور آخر میں یہی فیصلہ دے دیتے: اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ[۱۲]

کچھ علما یہ کہتے تھے: اگرچہ حق اس کے خلاف ہے[۱۳] مگر مصلحت بینی وقت کا تقاضا ہے۔ گویا ان کے نزدیک مصلحت حقائقِ اشیا کو متغیر کر سکتی ہے۔ انہی کا ایک گروہ تھا "اَلَّذِیْنَ هَادُوْا"[۱۴] یعنی وہ یہودی تو نہ تھے مگر افکار و کردار کے اعتبار سے یہودیوں کے مماثل تھے..... اَلَّذِیْنَ هَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ[۱۵]۔ وہ کلام کو اپنے ٹھکانے سے پھیرتے اور بدلتے رہتے تھے۔ اور اس طرح تحریفِ لفظی و معنوی کے مرتکب ہوتے تھے۔ اللہ نے ان کے دل سخت کر دیے۔

اکبری دور کے علما میں ایک قاضی نظام الدین غازی خان بدخشی (متوفی ۹۹۲-۱۵۸۴) بھی تھا[۱۶] اس نے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ کرنا جائز ہے۔ علما نے کان کھڑے کیے، غل مچایا، بحث مباحثے کے سلسلے پھیلے، پھیل کر الجھے۔ علما کا جوش تھا کہ نہ دم لیتا تھا، نہ لینے دیتا تھا۔ بدخشی

---

[۱۰] القرآن المجید، ۲: ۱۹۱

[۱۱] ایضاً، ۱۰: ۸۳ [۱۲] ایضاً، ۵: ۲۷

[۱۳] ایضاً، ۲۳: ۷۳ (وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ.....)

[۱۴] ایضاً، ۴: ۴۶، ۵: ۴۱، ۱۰: ۴۵ [۱۵] ایضاً، ۵: ۱۳، ۴۵ -

[۱۶] تذکرہ علمائے ہند، ۲۴۲ -

کی طرح اس کے حامی معقولات کے بڑے ماہر تھے۔ یہ بدخشی خود مُلّا عصام الدین[17]، اور ان جلیل القدر متکلمین کا شاگرد تھا جنھیں عبداللہ خان بن کوچکونجو ازبک (متوفی ۹۴۶ نے سمرقند اور بخارا سے جلاوطن کر دیا تھا[18]۔ یہ لوگ ہندوستان میں آرہے ہے۔ سجدے بارے میں بدخشی کے حامیوں نے کہا: ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو اور قرآن حکیم کے معانی غور کرو۔ امم قدیمہ کو دیکھو، وہ اپنے بزرگوں کے آگے تحفۂ عجز و نیاز سمجھ کر آداب سے پیش زمین پر رکھتے تھے۔ مثلاً ملائکہ کا سجدہ حضرت آدمؑ کو آخر کیا تھا؟ جواب ظاہر ہے: کہ تعظیمی باپ اور بھائیوں کا سجدہ حضرت یوسفؑ کو کیا تھا؟ جواب: تحفۂ ادب پیش کیا تھا نہ کہ پرستش بندگی۔ بس یہ بھی وہی سجدۂ تعظیمی ہے۔

الغرض سادہ لوح علما ہر طرف سے سخت لاچار تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا تھا۔ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ[19]۔ نرگس اپنی بے نوری پہ رو رہی تھی صدیوں سے رہی تھی اور سرمایۂ ملت کے نگہبان" کی ضرورت تھی۔ مفاسدِ وقت کی اصلاح کا معاملہ کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ امت میں تھی۔ قدرت نے فیصلہ کیا اور مجدد الف ثانیؒ کا وجودِ گرامی تنِ تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا[20]۔ چنانچہ فر بتوں پر پہلی "ضربِ کلیم" جمادی الآخرہ ۱۰۱۳ھ مطابق وسط اکتوبر ۱۶۰۵ء کو لگی۔ لوگوں نے کی بے دینی سے گھبرا کر حضرت مجددؒ سے فریاد کی، تو آپ سرہند سے آگرہ (اکبر آباد) پہنچے خانِ خاناں خان اعظم اور سید صدر جہاں اور مرتضیٰ خان کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا باغی ہو گیا ہے۔ توبہ کرے، ورنہ اللہ کے غضب کا انتظار کرے نے مناظرہ کی دعوت دی اور ایک مجلس کا انتظام کیا۔ دربار سجایا گیا۔ ایک سائبان اکبر کو ملا، اور مقابل میں مجددؒ کا خیمہ نصب کیا گیا۔ درمیان میں اکبر کا غرفۂ سلطانی۔ ابھی لگا ہی تھا کہ ایک سخت جھکڑ آیا، اکبری دربار تہ و بالا ہو گیا اور اکبر اور اکبر کے حامیوں کو

---

[17] براکلمن، ۲: ۴۷۵۔ (متوفی: ۹۴۴ھ)

[18] ہامر: GESCHICHTE DES OSM. REICHES ۱۰: ۸۱۰-۸۱۱

[19] القرآن المجید، ۲۴: ۴۰

[20] محمد اکرام: رودِ کوثر، ۱۷۷

ں، لیکن مجدد الف ثانیؒ کا خیمہ محفوظ رہا - چند دنوں بعد اکبر بھی اس دنیا سے رخصت
ہا [۲۱]

اکبر گیا، جہانگیر آیا - اہلِ اسلام اوّل اوّل کچھ کچھ خوش تھے، مگر یہاں تو گھوڑے
مگئے، گاڑی وہی پرانی ٹوٹی ہوئی - یعنی سجدۂ تعظیمی بدستور، ذبیحۂ گاؤ ممنوع، بدعاتِ
م جاہلیت موجود، اہتمام شریعت کے لوازم مفقود، مثلاً شہر یا پرگنے میں نہ کوئی قاضی
، مفتی نہ محتسب - مسجدیں خستہ حال، نہ زکوٰۃ نہ بیت المال، اور غیر مسلم ہیں تو جزیے
زاد - جب بادشاہ کو جام و سبو سے فرصت نہ ملے تو وہ احکام شریعت کی ترویج کیونکر کرے؟

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار!

ت کا تقاضا یہی تھا کہ ایک ایسی صاحبِ عزیمت ہستی سے جہانگیر کی ملاقات ہو جو سجدے سے
کرے، تاکہ اس طرح اسلام کی حقانیت واضح ہو جائے اور بدعات کا قلع قمع ہو [۲۲]

۲۳ خورداد ۱۰۲۸ - ۱۰۲۹ھ یا یکم جون ۱۶۱۹ کو جہانگیر نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو حاکم
رہند کی معرفت دربار میں بلوا بھیجا - اس نے سن رکھا تھا کہ سرہند کا ایک مشائخ زادہ اپنے تئیں
رت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھتا ہے اور اس نے اپنی کتاب "مکتوبات" میں
ی گستاخیاں کی ہیں جن پر کفر و زندقہ کا اطلاق ہوتا ہے - ایک جمِ غفیر کو اس نے مرید بنا رکھا
، عقل و خرد سے عاری ہے لہٰذا سخت مغرور اور خود پسند ہے -

جب حضرت مجدد الف ثانیؒ تشریف لائے تو وزیر نے ملاقات کے لیے ایسے وقت کا انتخاب
یا جب جہانگیر لشکر میں تھا - بادشاہ نے کہا: ہم نے سنا ہے کہ تم اپنے تئیں حضرت ابوبکر صدیقؓ
ترجیح دیتے ہو - حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے فرمایا، ہم تو حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ
بھی کہ خلیفۂ چہارم ہیں حضرت ابوبکر صدیق پر ترجیح نہیں دیتے تو اپنے تئیں کیونکر دیں گے -
جس عبارت سے لوگ یہ مطلب نکالتے ہیں اس کا یہ منشا نہیں ہے بلکہ اس کی ایسی مثال ہے

---

[۲۱] ۱۳ جمادی الآخرہ ۱۰۱۴ - ۲۶ اکتوبر ۱۶۰۵

[۲۲] محمد فرمان - حیاتِ مجددؒ، ۴۹ -

کہ اگر تم کسی احدی کو اپنے پاس بلواؤ اور سرگوشی کرو تو ضرور ہے کہ وہ شخص پنج ہزاری اور ہفت ہزاری کی جگہ پر گزرتا ہوا آئے گا اور سرگوشی کر کے پھر اپنے مقام پر واپس آجائے گا تو اس عبورِ مقاماتِ پنج ہزاری و ہفت ہزاری سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شخص ان ہفت ہزاریوں سے بڑھ گیا۔ بادشاہ یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا۔

حاسد نے جب اپنی تدبیر کو بے انجام ہوتے دیکھا تو کہا: جہاں پناہ یہ شخص کیسا متکبر ہے کہ اس نے "ظل اللہ" کی خدمت میں نہ سلام کیا اور نہ سجدۂ تعظیمی بجالایا۔ جہانگیر نے افروختہ خاطر ہو کر پوچھا: تم نے نہ سلام کیا نہ سجدہ؟ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جواب میں فرمایا: سجدہ تو اللہ کے سوا کسی اور کو جائز نہیں، اور السلام علیکم اس لیے نہیں کہا کہ تم اگر جواب نہ دیتے تو گنہ گار ٹھہرتے۔ شہنشاہ نے سجدہ بجالانے پر اصرار کیا۔ حضرت نے انکار کر دیا۔ شہزادہ خرم جو بعد کو "شاہجہان" کے لقب شاہی سے تخت نشین ہوا، حضرت مجدد الف ثانیؒ سے خاص عقیدت رکھتا تھا، بہت مضطرب ہوا۔ اس نے افضل خان اور مفتی عبدالرحمان کو حضرت کی خدمت میں بھیجا۔ دونوں سراسیمہ و پریشان حاضر ہوئے اور فتویٰ مکتوبہ پیش کیا۔ لکھا تھا: اس حال میں سجدہ کرنا جائز ہے کہ جان کا بچانا فرض ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا: ایسی حالت میں سجدہ کرنا رخصت ہے مگر عزیمت اسی میں ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو سجدہ نہ کرے[۳۵]

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے شہنشاہ جہانگیر کو سجدۂ تعظیمی کرنے سے انکار کر دیا اور شہنشاہ نے طیش و غضب میں آکر حضرتِ مجدد کو گوالیار کے قلعہ میں محبوس کرنے کا حکم صادر کیا۔ یہیں تک اکتفا نہ کی بلکہ حکم دیا کہ سرہند میں آپ کا دولت کدہ، باغ، کتب خانہ سب کچھ لوٹ لیا جائے۔ مگر صبر و تسلیم کے اس مجسمے نے زبان سے اف تک نہ نکالی۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی ایک نظم میں اسی اہم تاریخی واقعہ کا ذکر کیا ہے:

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

---

[۳۵] محمد فرمان: حیات مجددؒ۔ ۲۱، ۲۲، ۲۷ ملخصاً۔

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے　　جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

جناب مجدد الف ثانیؒ گوالیار میں ایک سال تک قید کے مصائب جھیلتے رہے۔ اگرچہ تزکِ جہانگیری میں درج ہے : در رفتن و بودن مختار گردانیدیم[۲۴]۔ مگر فی الحقیقت جہانگیر نے حضرت مجددؒ کو قلعہ کی قید سے نکال کر لشکر کی قید میں رکھ دیا تھا۔ ایک سال کے بعد جہانگیر نے ان کو گوالیار سے کشمیر بلوایا اور آزاد کر دیا۔ یہ تاریخ ۲۸ خورداد جلوس پانزدہم (رجب ۱۰۲۹ھ) مطابق یکم یا ۲ جون ۱۶۲۰ء تھی[۲۵]۔ یہ ایک تاریخی دن ہے۔ یہ یوم نجات ہے۔ کیونکہ اس روز شہنشاہ جہانگیر نے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی مندرجہ ذیل سات شرطیں مان لیں :

۱۔ سجدۂ تعظیمی اسی روز سے موقوف کیا جائے۔

۲۔ مسجدوں کو آباد کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

۳۔ تذبیح بقر کے انسداد کے احکام منسوخ کیے جائیں۔

۴۔ خادمانِ شرع مثلاً قاضی، مفتی، محتسب اہم اسلامی شہروں میں مقرر کیے جائیں۔

۵۔ غیر مسلموں سے جزیہ لیا جائے۔

۶۔ احکامِ شرع کی ترویج کی جائے اور بدعتیں رفع کی جائیں۔ اور

۷۔ بوجہ حمایتِ دین زیرِ عتاب آنے والے مسلمان قید سے رہا کیے جائیں۔

سجدۂ تعظیمی شرک کی ایک صورت تھی جسے اصحاب التاویل اور اہل الاہوا نے اپنے طور پر جائز ثابت کر رکھا تھا۔ چنانچہ بادشاہ کو سجدۂ تعظیمی کرنے سے انکار کر دینا اور پھر اس سے اپنی شرطیں منوا کر اس مشرکانہ بدعت کو ختم کرانا درحقیقت حضرتِ مجددؒ کا ایک عظیم کارنامہ ہے اور انھوں نے تجدید و احیائے دین کے لیے جو خدمات سرانجام دیں ان میں اس بدعتِ سیئہ کا خاتمہ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

---

[۲۴] تزکِ جہانگیری (پانزدہم سالِ جلوس) ص ۳۱۲۔

[۲۵] ایضاً ص ۲۷۴، ۳۱۲۔

انتخاب حدیث

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ کتاب ان منتخب احادیث کا مجموعہ ہے جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے فقہ کی تشکیلِ جدید میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ہر حدیث کی الگ سرخی قائم کی گئی ہے اور اس کا سلیس ترجمہ بھی درج ہے۔

یہ مجموعہ حدیث کی چودہ کتابوں کا خلاصہ اور بے مثل انتخاب ہے۔

صفحات : ۶۸۴ قیمت پینتیس روپے

کلامِ حکیم

مرتبہ : ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

یہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا مجموعۂ کلام ہے۔ خلیفہ صاحب مرحوم کو شعر گوئی کا ذوق فطری طور پر ودیعت ہوا تھا اور انھوں نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی وغیرہ مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کر کے اپنی شعری صلاحیتوں کا سکہ بھی بٹھا دیا۔ اس مجموعہ میں خلیفہ صاحب کے زمانۂ طالب علمی سے لے کر آخری دور تک کا کلام شامل ہے جس کا بیش تر حصہ زمانۂ قیام حیدر آباد دکن (۱۹۱۸ - ۱۹۴۳) کی ادبی صحبتوں کی یادگار ہے اور اس مجموعے میں ان کے متوازن و متحرک ذہن کے گوشے بے نقاب نظر آتے ہیں۔

صفحات : ۱۵۲ قیمت : آٹھ روپے

ملنے کا پتہ : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور